حکمتِ قرآن

قسط نمبر 3

حمید الدین فراہیؒ
ترجمہ: خالد مسعود

(استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ایک اہم غیر مطبوعہ تصنیف حکمۃ القرآن کی تیسری قسط 'تدبر' لاہور کے شکریہ کے ساتھ شائع کی جارہی ہے۔) (ادارہ)

حکمت علم اور عمل کی جامع ہے :

ایک حکیم کے پاس جو علم ہوتا ہے وہ اس نے دوسروں کی تقلید کرکے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مشاہدہ کی بناء پر حاصل کیا ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی فطرت کی آواز سنتا ہے کیونکہ اس کی فطرت دوسری تمام چیزوں کی نسبت اس سے قریب تر ہوتی ہے۔ اس کے استدلال کی بنیاد ظن وتخمین پر نہیں ہوتی، نہ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ محض چند اجزاء کو دیکھ کر ان سے عام کلیے اخذ کرلے۔ اس کے برعکس وہ اشیاء کے متعلقات ولوازم کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا اخذ کردہ نتیجہ اس کی بصیرت ہی کا ایک پہلو بن جاتا ہے۔

حکیم اگر کسی چیز میں دلچسپی لیتا ہے تو وہ بھی کسی دوسری چیز کے حوالے سے نہیں ہوتی بلکہ وہ بلاواسطہ اسی چیز کی جستجو کرتا ہے جو اس کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے زیادہ لذیذ چیز اور اس کی زندگی کا مقصود ہوتی ہے۔ علم وعمل میں جو لوگ پختہ کار ہوئے ہیں ان کا طرزِ عمل ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جو علم حاصل ہوا وہ ان کے سینے کی ٹھنڈک بن گیا اور جس مطلوب کو انہوں نے اختیار کرلیا تو اس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، ان دونوں دولتوں کو انہوں نے خوب خوب سمیٹا اور اس سے اطمینان پایا۔ ایسے ہی لوگ حقیقی عالم وعامل اور واقعی

مخلص ہوتے ہیں۔ ان کا علم نہ تو محض برائے علم ہوتا اور نہ بارد یا مردہ ہوتا ہے۔ یہ علم سراپا زندگی، مجسم قوت اور شوق و عمل کا جامع ہوتا ہے۔ پس ایک حکیم نفس اور اس کی بیماریوں، دنیا اور اس کی ناپاکیوں، تقویٰ اور اس کی لذتوں اور شفا بخشیوں سے واقف ہو جاتا اور اپنے رحیم، کریم اور حکیم خدا کو پہچان جاتا ہے۔ وہ خدا پر ایمان لاتا، اس کی طرف مائل ہوتا اور اس کے جمال و کمال کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ غفلت کی تلخیوں کو بھی جان جاتا ہے اس لیے اس کی طرف سے نظریں پھیر لیتا ہے۔ اس کا علم، زندہ ایمان اور ایسا کامل یقین ہوتا ہے جیسے وہ غیب کا مشاہدہ یقین کی آنکھوں کے ساتھ کر رہا ہو۔ غیب کا یہ مشاہدہ اس مشاہدہ سے واضح تر ہوتا ہے جو وہ سر کی آنکھوں کے ساتھ کر سکتا ہے۔ ایک آدمی جب کسی خوبصورت حقیقت کو پا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کو محبوب نہ بنائے لہٰذا ایمان کے نتیجہ میں اللہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ	جو لوگ ایمان لائے وہ سب سے زیادہ
(بقرہ : ۱۶۵)	خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔

اس آیت میں حقیقی ایمان ہی کو حُب کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان جب جب خدا کو یاد کرتے ہیں وہ اس کی عظمت و کبریائی سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اس سے ان کے دل کانپ جاتے ہیں، خدا کی بزرگی اور اس کا جلال ان پر روشن ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ اس کی طرف اڑ کر پہنچتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی رضا کے حوالے کر دیتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ	مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا
اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ	جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا	اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ
(انفال: ۲)	ان کے ایمان میں اضافہ کریں۔

حکمت کی نشو ونما کی شرائط:

حکمت دل کی زندگی ہے۔ زرخیز زمین کے اندر بیج ڈالا جائے تو وہ اُگتا ہے اسی طرح دلِ زندہ کے اندر علم کا بیج نشو ونما پاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس دل میں علم کو زندگی ملے اور وہ

نشو و نما پانے والے بیج کی طرح پھلنے پھولنے لگے تو یہ دل کی زرخیزی کی ایک دلیل ہے۔ علم کی زندگی کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اس کو اپنے حال پر طاری کرلے اور اس کے نتیجہ میں عملِ صالح اختیار کرے۔ رہی نشو و نما تو یاد رکھنا چاہئیے کہ زندگی صرف حرکت پیدا کرنے والی چیز ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں ایک خاص ترتیب اور نظام کا پایا جانا ضروری ہے۔ کوئی زندہ شے ایسی نہیں جس میں نظام نہ ہو، لہٰذا ایک منظّم علم کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ اس کا حسن، اس کی رونق اور اس کا نفع ہوتا ہے۔ دل کی زندگی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر علم کی نشو و نما کی صلاحیت موجود ہو۔ گویا اصل معاملہ دل کی زندگی ہی کا ہے۔

حکمت کا معاملہ یہ ہے کہ یہ کسی ایسے شخص کو عطا نہیں کی جاتی جو اس کو پانے کا اہل نہ ہو۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ایک حکیم دوسروں تک اس کے پہنچانے میں بخل سے کام لیتا ہے بلکہ حقیقت میں وہ اس کے لیے غیرت رکھتا ہے اور غلط بخشی کے نتیجہ میں اس کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر بنجر زمین میں بیج ڈال دیا جائے تو وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ پھر علم کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اگر یہ نفع نہ دے تو نقصان پہنچانے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اسی لیے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم یہ دُعا فرمایا کرتے تھے:

اللھم انی اعوذبک من علم	اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں
لا ینفع وقلب لا یخشع	اس علم سے جو نفع نہ دے اور اس دل سے جو عاجزی اختیار نہ کرے۔

آنحضرتؐ کی یہ دعا اس عظیم حقیقت پر بھی دلیل ہے کہ اگر دل خشوع کی صفت سے خالی ہو تو آدمی کا علم اس کو کوئی نفع نہیں دیتا۔ یہیں سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کون سی چیز دل کو زندہ رکھتی اور اس میں حکمت کو قبول کرنے کی صلاحیت کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ اصل میں دل کا خشوع وہ دروازہ ہے جس کے راستے حکمت دل میں داخل ہوتی ہے۔ یہ حکمت کو پانے کی شرطِ اوّل ہے اور اس کی تصریح قرآن مجید اور حدیثِ صحیح دونوں سے ہوتی ہے لہٰذا ہمارے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ خشوع حاصل کیسے ہوتا ہے اور حکمت کے حصول کے لیے دل کو کیسے تیار کیا جاتا ہے۔

ایک غور کرنے والا شخص جب آسمان، زمین اور انفس میں خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور رحمت کا مشاہدہ کرتا ہے، پھر اپنے نفس کو دیکھتا ہے کہ وہ انتہائی بلندی اور انتہائی پستی کے درمیان رکھ دیا گیا ہے تو یہ چیز اس کے اندر خدا کی خشیت اور امید ساتھ ساتھ پیدا کرتی ہے۔ پھر اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے، اس کا پیدا کرنے والا عادل اور ایک پاکیزہ رب ہے۔ اس کے بالمقابل وہ خود غلط کار، بھٹکنے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر اس قدر خشیت پیدا کرتا ہے کہ وہ خلوت وجلوت میں حدودِ الٰہی کی پابندی کرنے لگتا ہے۔ وہ خواہشاتِ نفسانی کی پیروی سے باز رہتا ہے۔ خشیت اور تقویٰ کی ان صفات سے اس کا قلب صاف ہوتا اور حکمت کے نور کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کتاب الامثال میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ حقیقت بیان فرمائی کہ حکمت کا سرا رب کی خشیت ہے۔

اسی خشیت اور تقویٰ کے نتیجہ میں بندہ خشوع اور فروتنی کا لباس اوڑھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ساری بادشاہی تنہا اس کے منعم رب کی ہے اور وہ اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ رب سے دور ہونے سے ڈرتا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے۔ وہ اسی سے طالب ہوتا اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ اس خشوع کے نتیجہ میں آدمی کے اندر علم کی تعظیم اور اس کے بارے میں حسن ظن پیدا ہوتا ہے اور اعتراض کرنے کی روش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز حکمت کی نشو و نما کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہے اور یہ خشوع رفع درجات کا ذریعہ بنتا ہے جیسا کہ فرمایا:

وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ: ۱۱)	اور جب کہا جائے کہ (مجلس سے) اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ اللہ ان لوگوں کے جو تم میں سے اہلِ ایمان ہیں اور جن کو علم عطا ہوا ہے، مدارج بلند کرے گا۔

اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ اس آیت میں بھی ہے:

فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (النحل: ۶۹)	پھر اپنے پروردگار کے ہموار رستوں پر چل۔

حکمت بالتدریج حاصل ہوتی ہے :

حکمت کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ یکبارگی یہ کبھی حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ مختلف مواقع پر آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح مکان یکبارگی تعمیر نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اسی طرح کا معاملہ حصولِ حکمت کی راہ میں پیش آتا ہے۔ غذا کو بڑی مقدار میں ایک ہی دفعہ معدے میں ڈالنے کی کوشش کی جائے تو معدہ اس کو قبول نہیں کرتا اور وہ ضائع جاتی ہے اسی طرح قلب کے اندر بھی حکمت کو ایک ہی مرتبہ میں اٹھالینے کی طاقت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو یکبارگی نہیں اتارا گیا۔ اس کو تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی مصلحت یہ بتائی گئی کہ :

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ (الفرقان: ۳۲)	تاکہ اس کے ذریعے سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو تدریج و اہتمام کے ساتھ اُتارا ہے۔

حکمت کی تعلیم دینے والا بھی اس طریقہ کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ مختصر کلام کرتا ہے تاکہ شاگرد اس پر جلدی سے نہ گزر جائے بلکہ اس کو سمجھنے کے لیے مزید شرح و تفصیل کا خواہشمند استاد کا محتاج اور اس کے ساتھ طویل صحبت کا طالب ہو۔

نظمِ قرآن صرف اہل شخص پر کھلتا ہے :

اسی حقیقت کے فہم سے میری رہنمائی قرآن مجید کے نظم کی حکمت کی طرف ہوئی ہے قرآن نے اپنی تعلیم کے لیے کئی طریقے اختیار کیے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ہر ہر آیت کو ایک مستقل تعلیم کا حامل بنایا ہے۔ جب آدمی ایک تنہا آیت کو محلِ تدبر بناتا ہے تو اس کو اسی پر اپنی توجہ مرتکز کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہوئی جیسے کارخانوں کے کارکنوں کے لیے ایک مخصوص شعبہ ہی میں مشغولیت کافی سمجھی جاتی ہے۔ اگر کارخانے کا پورا نظام ان پر کھول دیا جائے تو وہ ششدر رہ جائیں اور ان کے لیے وہ کام کرنا بھی مشکل

ہو جائے جس کے کرنے کی وہ اہلیت رکھتے ہیں۔ کامل نظام ہمیشہ اس شخص پر کھولا جاتا ہے جو اس کو سمجھنے کا اہل ہوتا ہے۔ کارخانے کے کارکن کی طرح فوج کا ایک سپاہی اپنے مورچے پر ڈیوٹی کے لیے کافی ہوتا ہے اور وہ اس سے ہٹ کر اس سے زائد کسی چیز کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا۔ لڑائی کا پورا نقشہ صرف کمانڈر کے پاس ہوتا ہے اور وہی اس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر بہت سے لوگوں نے قرآن سے معمولی واقفیت پر قناعت کر لی اور اس کے اجزا کے باہمی ربط کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن جو شخص حکمت کی کسی وادی کا آشنا ہو جاتا ہے وہ قرآن کے مجموعی نظم کی طرف رہنمائی پاتا ہے۔ اس کی نظر میں مجموعہ آیات کی خوبیاں، بلند حقائقِ علیہ، علوم الٰہیہ کے مختلف شعبوں کا نقطۂ جامعہ اور کتاب اللہ سے حاصل ہونے والی شفائے کلی، ہر چیز سما جاتی ہے۔

مسلمانوں کے اولوالامر کے لیے نظم قرآن سے واقف ہونا ضروری ہے :

اوپر کی بحث سے ہم اس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات جس شخص کے حوالہ کیے گئے ہوں، اس کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ کتاب کے نظم سے بے خبر رہے کیونکہ اس کے لیے اصل رہنما قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا حال یہ ہے کہ وہ قرآن کے متفرق امور ہی سے واقفیت رکھتا ہو اور صفات کے مدارج اور نظام سے بے بہرہ ہو تو ایسا لیڈر افراط و تفریط کے درمیان ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اس کا اجتہاد جانبداری پر مبنی اور حق سے دور کرنے والا ہوگا۔

ظواہرِ شریعت اور ان کے اصول و حقائق کے مابین وہی تعلق ہے جو عوام اور ان کے خواص و علماء کے مابین ہے۔ جس طرح عوام اپنے خواص پر غالب نظر آتے ہیں اسی طرح ظواہرِ شریعت دین کی روح پر غالب نظر آتے ہیں۔ اس بات کو ہادیٔ علیہ السلام نے اچھی طرح واضح فرمایا۔ آپ نے خوارج کے معاملہ میں اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کیا ہے[1]۔ ملت کا نظام خراب اس وقت ہوتا ہے جب اشرار کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ ان کے حملے عوام پر ظاہری امور میں تو جاری رہتے ہی ہیں اور یہ ان کی بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش

کرتے ہیں لیکن بعد میں ان کو ان لوگوں کی تائید بھی حاصل ہو جاتی ہے جن کی عقلیں کوتاہ لیکن کام کرنے میں وہ بہت تیز ہوتے ہیں۔ اس طرح اشرار غلبہ پا کر ملت کی تنظیم کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔

اوپر ہم نے دین دار لیکن جاہل لوگوں کے غلبہ کے نتائج بیان کیے تھے اور اب اشرار کے غلبہ کی مضرت واضح کی ہے۔ اصولی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس صاحب امر نے فرع کو اصل کی جگہ دے دی اور پست کو بلند کا درجہ دیا اس نے ملت کے نظام کو منتشر کر دیا۔ اس سے نظم قرآن کو سمجھنے کا فائدہ اور اس سے بے خبری کا نقصان واضح ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کی اصلاح (اور اس کے ساتھ دوسری امتوں کی اصلاح) اسی حکمت سے ہو گی جس کی طرف قرآن رہنمائی دیتا ہے۔ اس حکمت تک پہنچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ آدمی یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے شاندار نظم کے اندر کیا کیا معارف رکھ دیے ہیں۔ جو شخص نظم کا لحاظ رکھے بغیر حکمتِ قرآن کو جاننا چاہے گا۔ وہ کتاب اللہ کے فہم میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا اور اپنی تدابیر میں گمراہی میں پڑ جائے گا۔

نظامِ دین کی حکمت :

حکمت کی تعمیر اس اساس پر ہوتی ہے کہ ہستی کے مختلف اجزا کے درمیان موافقت کی نوعیت معلوم ہو۔ یہ علم اس وقت حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کائنات کے نظام کو نہ سمجھا جائے اور یہ نظام اسی وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ اس کے تمام اجزا ایک ہی نظام کے اجزا ہیں۔ دو یا دو سے زیادہ چیزوں میں جب بھی موافقت کے پہلو تلاش کیے جائیں تو اس موافقت کی ایک خصوصیت سامنے رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ مثلاً آپ زید کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوتے ہیں لیکن آپ کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ وہ عمرو کا باپ بھی ہے۔ گویا کسی بھی نظام رکھنے والی چیز میں ہمہ دانی ممکن نہیں۔ یہ حقیقت بھی جانی پہچانی ہے کہ آپ ایک جملہ کے ہر جزو کا موقع و محل اور تمام اجزا کی باہمی نسبت جانے بغیر جملہ کے معنی نہیں سمجھ سکتے، محض الفاظ کے معنی جاننا فہمِ کلام میں اس وقت تک مفید

نہیں ہوتا جب تک کہ پورا جملہ سمجھ میں نہ آئے بلکہ جب تک آدمی جملہ کے صحیح معنی کو اخذ نہ کرے۔ اس میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی تک بھی اس کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ ٹھیک اسی طرح اس حکیم کو بھی مشکل پیش آتی ہے جو پوری کائنات کے نظام اور اس کے اندر موجود وحدت پر غور کر رہا ہوتا ہے۔

نظامِ کائنات کی وحدت:

کائنات میں صرف ایک ہی نظام اور ایک ہی مسلسل نعمت کا ظہور ہے۔ اس میں جو تضاد نظر آتا ہے یا تو وہ خیر ہی کو بر آمد کرنے کے لیے ہے یا وہ جوڑوں جوڑوں میں موافقت کے نہ سمجھنے کے باعث ہے جس کے نتیجہ میں کائنات کے اندر پائے جانے والے فساد اور شر کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھ لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اضداد کا حوالہ بہت زیادہ دیا ہے لیکن ان کے جوڑے ملا کر بتایا ہے کہ ان اضداد سے کس طرح خیر کے نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ ایک حکیم جب اضداد پر غور کرتا ہے تو وہ بھی ان کی منفعت اور ان میں خیر کے پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس معاملہ میں قدماء کا طریقہ بھی یہی تھا اور ان کے بعد ہر زمانے کے حکما بھی اسی طرح غور کرتے رہے۔ حافظؔ نے کہا ہے ؎

نیست در دائرہ یک نقطہ خلاف از کم و بیش
کہ من ایں مسئلہ بے چون و چرا می بینم

کائنات کا خالق کامل ہستی ہے:

کائنات میں جس ہستی کا وجود لازم ہے وہ صفت کمال رکھتی ہے۔ جب محض وجود نہ چھپا رہ سکتا اور نہ بے کار رہ سکتا ہے تو پھر کامل ہستی کیسے معطل و مخفی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا اس کا تقاضا ہوا کہ ایجاد کرے۔ ایجاد وہاں ہوتی ہے جہاں پہلے کچھ نہ ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حرکت کے تصور کے لیے پہلے سکون کا تصور ضروری ہے۔ پس قدیم ذات نے عدم کو وجود کا، سکون کو حرکت کا، تاریکی کو روشنی کا، کمزوری کو قوت کا، پستی کو بلندی کا اور جبر

کو اختیار کا جامہ پہنایا۔ اس نے تخلیق کیا، اشیاء کو نمودار کیا، خلق پر شفقت اور کرم کیا اس کو علم اور عزت دی۔ اس نے انسان کے اندر علم اور جہالت، محبت اور بغض، سخاوت اور بخل کی متضاد صفات کا امتزاج رکھا جس کے باعث اس کو کوشش، محنت اور مشقت اور ترقی اور نشوونما کا وسیع میدان میسر آ گیا۔ پس ناقص کے لیے کمال، کمزور کے لیے قوت جہالت کے مقابلہ میں علم اور شک کے مقابلہ میں یقین کا حصول مقصود قرار پایا۔ لیکن اولین ہستی ہی آخری ہستی بھی ہے اور باقی سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اس بات کو یوں فرمایا:

وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (آل عمران: ۱۸)	اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز سے پہلے تھا۔ باقی سب اس کی مخلوق ہے۔ یہ سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان سب کا رُخ اسی کی جانب ہے اور وہی ان کا مقصود ہے۔

کامل وجود کے لیے لازم ہے کہ وہ قدیم، باقی رہنے والا، ازلی اور ابدی ہو، اس کی قوت اور پاکیزگی کمال کو پہنچی ہوئی ہو، لہٰذا اس نے جو کچھ چاہا وہ خیر ہے، جو کچھ واقع ہوا وہ خوبصورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ پھر جس طرح ہستی اس پر ختم ہوتی ہے اسی طرح خیر و خوبی بھی اس پر ختم ہے۔ اگر یہ بات نہ مانی جائے تو اس کے وجود کا کمال مجروح ہوتا ہے۔ پس:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الحدید: ۳)	وہی اول بھی ہے وہی آخر بھی اور ظاہر بھی اور باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

نظامِ دین کی حکمت کی ضرورت

اس بنیاد پر اب دین کے معاملہ پر نگاہ ڈالیے۔ دین اگر صحیح ہو تو لازماً اس کا نظام بھی صحیح ہونا چاہیئے۔ نظام کے صحیح ہونے سے مراد یہ ہے کہ دین کے عقائد اور اعمال کے

درمیان، دین اور فطرتِ انسانی کے درمیان اور دین اور کائنات کے درمیان کامل موافقت ہو، جب یہ سب موافقتیں صحیح ہوں گی تو ایسا دین پُر حکمت، فطری اور سیدھا سادا ہوگا جو علیم و حکیم رب کی راہ دکھائے گا اور جو شخص اس کی حکمت سے واقف ہو کر اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا، وہ نورِ بصیرت پر ہوگا۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک عالم کی ایک ایسے عبادت گذار پر فضیلت کیوں بتائی گئی ہے جس کی ظاہری عبادت میں کوئی خلل یا نقص نہیں ہوتا۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں ہے کہ عابد فرائض و سنن اور اوامر و نواہی کے جاننے میں عالم کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے علم کے بغیر تو عبادت کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عابد ظاہری احکام کا عالم تو ہوتا ہی ہے۔ اگر وہ عالم نہیں ہوتا تو دین کی حقیقتوں کا عالم نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ اپنے رب کی عبادت اس طرح نہیں کرتا جس طرح کرنا چاہئیے۔ لہٰذا دین کی حکمت جاننے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی ایک بے خبر آدمی گمان کر سکتا ہے۔

اپنے اس مقالہ میں ہم دینِ اسلام کی ہیئتِ کلّی پر روشنی ڈالیں گے، خارج سے اس کی نسبت کو بیان کریں گے اور اس کے داخلی اجزا کی باہمی نسبتوں اور ان کی تقدیم و تاخیر کے مواقع کی وضاحت کریں گے تاکہ ان کے اجزا کا باہمی ربط اور خارج کے ساتھ ان کی موافقت معلوم ہو اور ہم یہ جان سکیں کہ حق کے مختلف اجزا ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں ہیں:

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ	تم خدائے رحمان کی صفت میں کوئی
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ	خلل نہیں پاؤ گے نگاہ دوڑاؤ تو کیا
(الملک: ۳)	تمہیں کوئی نقص نظر آتا ہے؟

پس ہم قرآن اور فطرتِ انسانی کے درمیان توافق، خلق اور امر کے درمیان توافق اور ربِ عزیز و حکیم اور انسان، جس کو اس نے بہترین ساخت عطا فرمائی ہے، کے درمیان تعلق کو واضح کریں گے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر انسان اور تمام مخلوقات کے درمیان تعلق معلوم ہوگا جیسا کہ قدیم فلاسفر نے کہا ہے کہ انسان عالمِ اکبر ہے۔ لیکن ہم یہ توافق اپنی تاویل کے مطابق بتائیں گے جس میں ارادہ کرنے والے اور اس کے ارادہ کے درمیان، فعل اور اس کے مقصد کے درمیان

مفعول اور اس کے ذریعہ کے درمیان، ذات اور اس کی صفات کے درمیان اور جو چیز طاقت میں ہوتی ہے اور جو عملاً ظاہر ہوتی ہے اس کے درمیان موافقت واضح ہو گی۔ کیونکہ انسان کا موقف دو حالتوں کے درمیان رہتا ہے، یا تو وہ موافقتوں کے وجود ہی کا انکار کر دے گا یا وہ ان کا یقین رکھے گا۔ البتہ ان موافقتوں کے اجزا کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آدمی کو ان کی باہمی نسبت معلوم نہ ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے نظام کی پہچان سے تعبیر کیا ہے۔

ہدایت وضلالت :

قرآن نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ حقیقی دین صرف اسلام ہے اور یہی اصل فطرت ہے۔ اسی طرح اس نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے کہ قرآن اصل ہدایت ہے یہی رب کی راہ دکھاتا ہے اور دینِ فطرت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح اس نے قرآن اور انسان کے درمیان موافقت اور خلق اور امر کے درمیان موافقت کو واضح کیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰهٰ : ۵۰)	اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی۔
اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (الاعلیٰ : ۲-۳)	جس نے خاکہ بنایا پھر نوک پلک سنوارے، جس نے مقدر کیا اور ہدایت بخشی۔

آیت میں لفظ سوّٰی آیا ہے۔ تسویہ یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کے تمام اجزا کو ایک دوسرے کے لیے موزوں اور مناسب اور ایک مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بنایا جائے تاکہ اس کے بعد ان کے استعمال سے اس مقصد کو پورا کیا جا سکے۔ خلقت کو خوب بنانے اور محکم کرنے کا مفہوم بھی یہی ہے جیسا کہ ان آیات میں ہے۔

اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ : ۷)	اس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے۔

اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ (النمل: ۸۸) اس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

آیات کے یہ مفہوم نہایت واضح ہیں۔ اسی میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جس ذات نے پیدا کیا اسی نے ہدایت کا سامان بھی کیا اور جب وہ ہدایت دیتا ہے تو وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کا حکم نافذ ہو، لہٰذا فرمایا:

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے۔ (الاعراف: ۵۴)

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی ہدایت انسان کی اس ساخت اور فطرت کے موافق ہے جس پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے تو وہ اللہ کی ہدایت ہے اور اس کے راستہ اور ارادہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ مزید اس نے ہمارے نفوس کے اندر اس کی پہچان بھی رکھ دی ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں ھدٰی کے معنی یہ ہیں کہ خالق نے جس طرح ہر شے کو کسی نہ کسی نفع اور استعمال کے لیے پیدا کیا اسی طرح اس نے جن مقاصد کے لیے وہ شے بنائی ان کے حصول کے لیے اس کو رہنمائی بھی عطا کی۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ انسان کو ہر شے کی تفصیل کا علم بھی ہو۔ اس کے لیے اولاً اتنی بات کافی ہے کہ وہ ان مناسبتوں کو جانتا ہو جو اس کے اور اس شے کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ وہ ان کو جمع کر کے ایک لڑی میں پرو لے۔ ثانیاً تفصیل سے اتنا آگاہ ہو جتنا اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کے لیے وہ اس کا محتاج ہے اس طرح وہ کائنات کی دوسری تمام اشیاء کی طرح اس ذات کے ارادہ کے مطابق چل سکے گا۔ جس کی گرفت میں ساری کائنات کی باگ ہے۔

کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ہر ایک اپنے خاص دائرے میں گردش کرتا ہے۔ (یٰس: ۴۰)

قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ کہہ دو کہ ہر ایک اپنی روش پر کام کرے گا۔ (الاسراء: ۸۴)

اگر انسان اس علم کے خلاف چلے تو وہ اپنی فطرت کی مخالفت کرتا اور اپنے خالق کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔ البتہ وہ خالق کے بنائے ہوئے مضبوط نظام سے باہر نہیں نکل سکتا اور

نہ اس کے امر پر غلبہ پا سکتا ہے۔ کیونکہ خالق نے جس طرح ہر مخلوق کے لیے ایک اندازہ ٹھیرایا ہے اسی طرح اس نے انتظام بھی ٹھیرا رکھا ہے۔ اس نے انسان کو اختیار دیا تو خیر اور شر میں امتیاز کرنے کی صلاحیت تو دے دی لیکن خیر و شر میں سے کسی ایک پر اس کو مجبور نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن چونکہ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار بنایا تھا، اب اگر وہ اس کو کسی بات پر مجبور کرتا تو وہ خود اپنے پُر حکمت اور پُر شفقت ارادہ کے خلاف کرتا اور انسان کو اس نے جو آزادی عطا کی تھی اور اپنا قرب اس کو عنایت کرنے کے لیے اس کی آزمائش کا جو نظام بنایا تھا وہ خود اس کو توڑ دیتا۔ اس کے برعکس اگر انسان خود ہی اپنی فطرت کی نافرمانی کرتا اور اس کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹتا ہے تو وہ اس انجام سے دوچار ہوتا ہے جو اس نے اپنے نفس کے لیے خود اختیار کیا، البتہ اس طرح خالق کا ارادہ پورا ہو جاتا ہے۔

ہدایت و ضلالت کا یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کے لیے مزلّہ قدیم ثابت ہوا ہے اور مذاہب پر اس کے اثرات نہایت گہرے پڑے ہیں۔ اس پر نہایت تفصیل سے کلام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ مناسب موقع نہیں۔ یہاں اس سے صرف اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ ایک حکیم کے لیے کائنات اور اپنے نفس کی معرفت ضروری ہے تاکہ وہ اس نظامِ کُلی کو جان سکے جس کے تحت دین کا نظام آتا ہے۔

مقصدِ حیات و کمالِ سعادت :

نفسِ انسانی کی جد و جہد کی غایت دو چیزیں ہیں، ایک ان قوتوں اور صلاحیتوں میں کمال حاصل کرنا ہے جو اس کو ودیعت کی گئی ہیں۔ دوسری اس مقصد کو پانا جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

جو چیزیں ودیعت کی گئی ہیں اور ان کی تکمیل مقصود ہے۔ وہ علم و عمل کی دو قوتوں اور فہم و اخلاق کو نشو و نما دیتا ہے۔ علم اور فہم کا کمال یہ ہے کہ آدمی نور و ظلمت، حق و باطل اور ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے لگے اور عمل و اخلاق کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے مادی جسم کی

گھٹیا چاہتوں سے بلند ہو کر اپنی روح کی اعلیٰ پسند کو اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس کو ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے کی صلاحیت دی ہے جیسا کہ اس کو نیکی کے کام کرنے اور گھٹیا فانی چیزوں پر اعلیٰ اور پائیدار چیزوں کو ترجیح دینے کے اسباب سے بہرہ مند فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو سمع و بصر اور فواد کی صلاحیتیں عطا کیں۔ پھر اس کی طرف روشنی اتاری اور رسول بھیجے جب کہ اس کو اتنی صلاحیت دے رکھی تھی کہ جو چیز اس کے آگے رکھی جائے وہ اس کو پہچان سکے۔ اگر وہ نفس کی فطرت کے مطابق اس کو اسباب فراہم نہ کرتا تو انسان اس پیغام کے قبول کرنے کا مکلف نہ ہوتا جو اس کی طرف بھیجا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو مقصود مقرر کیا ہے وہ اپنے رب کی اطاعت نفس خواہ ناگواری کے ساتھ ہی ہو، اس کے فیصلہ پر راضی رہنا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے رب کے تقرب کے لیے اپنے وجود کے تقاضوں سے بھی دست بردار ہو جائے۔ جب انسانی اسی حالت میں اطمینان پالے اور اسی پر راضی ہو جائے تو اس کا رب اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوقات اس کی عبادت کرتی ہیں لیکن انسان جب عبادت کرتا ہے تو یہ اس کی طبیعت کی ساخت کے مخالف بات ہوتی ہے اس لیے اس کی یہ جدوجہد اور محنت نہایت کامل اور بڑی ہوتی ہے۔ اس کی شان یوں ہے جیسے وہ اپنے رب کی امانت کو ادا کرنے کے لیے ایک ایسی راہ پر چل رہا ہو جس میں چوروں، درندوں، رکاوٹوں اور پھسلن سے گھرا ہوا ہو بلکہ اس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اپنے وجود کی مخالفت کے باوجود اپنے رب کی طرف چل پڑا ہو، وہ خود اپنے نفس کا دشمن ہو جائے، اس کے ساتھ کشمکش کرے اور اس پر غالب آجائے۔ پھر اس کو قتل کر کے اپنے مولیٰ کے آگے ڈال دے۔

اوپر ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے آیت امانت

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین
وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ	اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں
يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا	نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا
الۡاِنۡسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا	اور اس سے ڈرے اور انسان نے

جَهُوْلًا۔ (الاحزاب : ۷۲)	اس کو اٹھالیا۔ بیشک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔

کی تاویل روشن ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انسان کی طبیعت کا یہ گھٹیا پہلو ہی ہے جو اصل میں اس کے تقرب کا موجب ہوا ہے۔ کوئی مجاہد اس وقت تک مجاہد نہیں ہوتا جب تک اس کا کوئی ایسا دشمن نہ ہو جس پر وہ غلبہ پانے کی جدوجہد کرے۔ کوئی مقرب بندہ اس وقت تک مقرب نہیں کہلاتا جب تک وہ قربانی کو ذبح نہ کرے۔ یہاں قربان کی جانے والی چیز نفس اور اس کی خواہش ہوتی ہے پس کسی دوسری مخلوق کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا جو انسان کو حاصل ہو سکتا ہے اور نہ کسی کی وہ عزت ہو سکتی ہے جو اس کی عزت ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو تخلیق کرنے کے بعد اس کے اپنی طرف عروج کے لیے ایک زینہ مقرر فرما دیا اور اس کو فہم اور اختیار کی آزادی کی جو خصوصیات عطا فرمائی تھیں ان میں اس کی ابتلا رکھ دی۔

ابتلا کی حکمت :

انسان کی ابتلا آرام و آسائش اور تکلیف دونوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ یعنی اس کا شکر بھی جانچا جاتا ہے اور صبر بھی شکر کی صورت میں وہ خلق کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے۔ اسی لیے ناشکری کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے :

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ (الفجر : ۱۷-۲۰)	ہرگز نہیں بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر ایک دوسرے کو اُبھارتے، اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے ہو اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔

صبر کی صورت میں انسان کو یہ علم ہوتا ہے کہ اس کی طرف خیر کو واپس لانے والا رب

تعالیٰ ہی ہے۔ انسان کی اپنی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کرے تاکہ وہ اس کو بدلہ عطا فرمائے۔ اس حقیقت کو یوں فرمایا:

وَإِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا۟ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ۔ (البقرہ : ۱۵۶)	اور جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔
إِنَّمَا يُوَفَّى ٱلصَّٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (الزمر : ۱۰)	جو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے ان کو ان کا صلہ بے حساب پورا کیا جائے گا۔

پس صبر ترقی کا زینہ ہے اور شکر اخلاص، عبادت گذاری، دعا اور عاجزی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جب ایک بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کا رب نہایت رحیم و کریم ہے تو وہ اس کے فیصلہ پر راضی ہو جاتا اور اس کی راہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث کرتا ہے، وہ اس کی طرف سکون پاتا ہے، دوسرے بندوں کے لیے شفقت کے جذبات رکھتا ہے اور یہ سب کچھ اطاعت کے جذبہ سے کرتا ہے تاکہ اپنے رب کو راضی کر لے۔ صبر و شکر کی دو بنیادی صفات میں جس قدر غور کیا جائے یہ حقیقتیں اسی قدر کھلتی جاتی ہیں۔

حاشیہ

۱ مصنف علیہ الرحمۃ کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مال بعض سرداروں میں تقسیم فرما رہے تھے۔ آپ کا مقصد ان کی تالیف قلب کرکے ان کو اسلام کا حامی بنانا تھا اس پر ایک شخص نے آگے بڑھ کر آپؐ کو ٹوکا اور کہا کہ آپ عدل سے کام لیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ آسمان و زمین کے رب نے میرے اوپر اعتماد کیا ہے اور وہ صبح و شام وحی کی امانت میرے حوالہ کرتا ہے، میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ یا حضرت خالدؓ بن ولید اٹھے اور اس معترض شخص کی گردن مارنے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے منع کر دیا اور فرمایا کہ اس قماش کے لوگوں کی ظاہری نمازیں

ایسی ہیں کہ تمہاری نمازیں ان کے آگے شرما جائیں۔ یہ قرآن مجید کی شاندار قرأت کرتے ہیں لیکن وہ ان کے گلے سے اوپر اوپر ہی رہتا ہے۔ یہ لوگ ظاہری نیکی کے باوجود دین سے نکل جانے والے ہیں۔ یہ حدیث مختلف واسطوں سے صحیح مسلم کی کتاب الزکوٰۃ میں باب ذکر الخوارج و صفاتہم میں آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ظواہرِ شریعت میں تو بے حد انہماک ظاہر کرتے ہیں لیکن اصولِ دین سے بالکل بے بہرہ ہوتے۔ حضورؐ پر اعتراض کرنے والے شخص نے یہ نہیں سمجھا کہ رسول پر ایمان لانے کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کی ظاہری نیکی اس کو دین کی حقیقت سے آگاہ کرنے میں ناکام رہی۔ (مترجم)